باب ۱۵

احیائے اسلام کی ضرورت

فطری رشتہ:

احیائے اسلام اور عالمی اسلامی جمعیت بندی پر اکابرِ سابقین ہی کی نہیں، موجودہ زمانے کے مختلف ملکوں کے دانشوروں اور رہنماؤں کی نظر رہی ہے۔ برِعظیم ہندو پاک میں اسلامی حکومت کا زوال، پھر خلافتِ عثمانیہ کا پارہ پارہ ہونا، بجائے خود سانحاتِ عظیم تھے۔نظریہ خلافت کی بناء پر غلط یا صحیح کسی نہ کسی قسم کی مرکزیت اور عالمِ اسلام کی برادری کا تخیل تو کم ازکم موجود تھا۔ مغربی تہذیب کےنظریہ،نیشنلزم نے جب علاقائیت کوجنم دیا تو احیائے اسلام ایک دُور کا خواب بن کر رہ گیا۔ اخوتِ عالم اسلام کا تصوربھی ماند پڑ گیا۔ پھر بھی اسلام کے نام پر ایک چنگاری سی عام دلوں کو برابر گرماتی رہی۔ وہ بے ساختگی میں دومختلف ممالک کے مسلمانوں کا ایک دوسرے کو گلے لگانا، کچھ اس طرح جاری رہا جیسے کہ یہ بات اسلامی خون میں ہو۔ اغیار نے لاکھ چاہا، عالمِ اسلام پر جگہ جگہ مختلف ابتلائیں آئیں پھر بھی گرم و سرد زمانہ کی دسترس اس آگ کو نہ بجھا سکی جو قلوب میں موجزن تھی۔ یہ رشتہ اخوت،عشقِ رسولﷺ کی بنا پر مسلمان قوم میں برابر مضبوط رہا۔ یہودیت، عیسویت، برہمنیت کے واریوں تو تمام مسلم ممالک کے اقتصادی، معاشی، اخلاقی، مملکتی نظاموں پر ضربِ کاری لگا گئے اورمسلمانوں کو دنیا کی سب سے گری ہوئی قوموں کی صفوں میں دھکیل دیا گیا۔ مگر ان کا کوئی حربہ بھی عشقِ رسولﷺ اور ناموسِ اسلام کے

جذبہ پر کارگر نہ ہو سکا۔ اس انتشار اور ابتلا کے زمانے میں بھی مختلف اسلامی ممالک میں اخوت کے اس فطری رشتہ کو پیوستہ رکھنے کی، ہادیانِ قوم کسی نہ کسی طرح کوشش کرتے رہے۔ اسلام کے پیغام کا سب سے بڑا کارنامہ یہی اخوت کا رشتہ مضبوط کر دینا تھا۔ اسی کے بل بوتے پر آج بھی باوجود تمام مادی کمزوریوں کے احیائے اسلام کی امیدیں اس قوم کا نظریہ بن چکی ہیں۔

صبحِ فروزاں:

گذشتہ دنوں کراچی کی ایک پختہ کار شخصیت حاتم علوی سے ملاقات ہوئی۔ ملت کے اس بے لوث خادم نے اپنی عمر کا خلاصہ کچھ اس پیارے انداز میں بیان کیا کہ میں نے ان کے ارشادات کو دوسرے لوگوں کے گوش گزار کرنا ضروری سمجھا۔ میری زندگی میں یہی پہلی یا دوسری شخصیت ہے جو ہمارے اس مثبت یقین کو پھر سے ہمارے لیے دہرا گئی کہ احیائے اسلام شروع ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ قوموں کی زندگی میں چند سال کا عرصہ کچھ نہیں ہوتا۔ نگاہِ بصیرت دیکھ رہی ہے کہ اسلامی اصول اپنی فطری سادگی اور صداقت کی بنا پر یقیناً دنیا میں پھیل رہے ہیں۔ اب اسلام کا زمانہ آ چکا ہے۔ اب کائناتِ عالم اجتماعی انداز میں وہ زمانہ دیکھے گی جس کی مثالی تصویر اسلامی تاریخ کے اولین چالیس سالہ دور میں دنیا کے سامنے پیش ہو چکی ہے۔ نا امیدی کا تو ذکر ہی کیا، صبحِ اسلام ہو کر رہے گی۔ جس طرح رات کے بعد سورج نکلنے کا ہر شخص کو یقین ہوتا ہے۔ اگر چہ یہ صرف مادی سطح تک کی بات ہے اسی طرح دینِ اسلام فطری طور پر عالم انسانیت قبول کرے گی۔ دینِ اسلام تو کائناتِ عالم کے لیے آخری پیغامِ خداوندی ہے۔ اس کی صبحِ فروزاں یقیناً ایک مسلّم بات ہے۔ جب

خود خالق حقیقی نے اسکی نشاندہی کر دی ہے تو یہ کیونکر نہ ہوگا۔ یہ محض خوش فہمی یا جذباتی عقیدے کی بات نہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے جس کو حاتم علوی جیسا نگاہِ بصیرت رکھنے والا انسان اس تمام پراگندہ ماحول کے باوجود، کھلی حقیقت کے طور پر دیکھ رہا ہے۔ یوں تاریکی میں روشنی کی ایک معمولی کرن بھی ہر انسان آسانی سے دیکھ لیتا ہے۔

اکابرین کے نظریے:

حاتم علوی نے کئی ایک اکابرینِ قوم سے دنیا کے گوشہ گوشہ میں ملاقاتیں کی ہیں۔ ان میں سے چند ایک مثالیں پیش کرنا خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ علوی صاحب کمال اتاترک سے ملے تو مسئلہ خلافت زیرِ گفتگو آیا۔ اتاترک نے فرمایا مسلمان کی نگاہ جذباتی حد تک کچھ بھی ہو حقیقت تو یہ ہے کہ عرصہ سے آپ کے خلیفہ یورپ اور انگلستان کے اشاروں پر چل رہے ہیں۔ حالانکہ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ اس دور میں ہر اسلامی ملک پہلے اپنی اپنی آزادی حاصل کرے تاکہ اسلامی مملکت کو اسلامی کہنے کا مقصد تو حاصل ہو۔ بغیر اپنی اپنی حالت بہتر اور مضبوط بنانے کے ہم اس آئیڈیل کا تصور کیسے کر سکتے ہیں جو ہماری نظر میں ہے۔ میں اپنے وقت میں صرف ترکی کے لیے ہی کچھ کر سکوں گا۔ دوسرے مسلم ممالک اپنی اپنی جگہ اپنے لیے کوشش کریں۔ پھر ہمارے بعد آپ جوانوں کا وقت آئے گا۔ اس وقت ایک عالمِ اسلام کی کنفیڈریشن بنا لینا اور سرپرست کو پریذیڈنٹ نہیں خلیفہ کہہ لینا۔ دیکھا جائے تو احیائے اسلام اور عالمی اسلامی اخوت بندی کی طرف اتاترک کی نظر کتنی حقیقت پسندانہ تھی۔ یوں محض جذباتی بن کر بے وقتی اقدام کتنا غیر مصلحتانہ ہوتا۔ قائداعظمؒ کا تقریباً

آخری زمانہ تھا اور وہ اتنے بیمار تھے کہ بول بھی نہ سکتے تھے۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب حیدر آباد پر ہندوستان کی فوج کشی کے وقت میر لائق علی آئے تھے اور قائداعظمؒ پر زور دے رہے تھے کہ حیدر آباد کو بچانے کے لیے کچھ فوج بھیجی جائے۔ اس قدر علالت میں بھی قائداعظمؒ نے جذبات پر قابو رکھا۔ ان کا ذہنِ رَسا اب بھی ویسا ہی روشن تھا جیسا کہ ایک مدبر کا صحت مندی کی حالت میں ہوتا ہے۔ انگلی کے اشارے سے قائداعظمؒ نے نہایت سختی سے یہ بات کہی کہ ہرگز نہیں۔ پہلے مجھے پاکستان کو بچانا ہے۔ یہ بھی اسلام کی خاطر ہے۔ حیدر آباد سے دلی ہمدردی ضرور ہے۔ مگر یہ کڑوا گھونٹ پینا ہوگا۔ اس تکلیف وہ حالت میں بھی قائداعظمؒ نے تدبر اور دانائی کو ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ حالانکہ کارکنانِ حکومت اور قوم، وقتی جوش اور جذبہ کے تحت بے چین تھے۔ یہ بھی وہی اتاترک والی بات تھی کہ پہلے اپنے کو مضبوط کریں۔ پھر عالمی اسلامی برادری کا سوچیں۔ تاکہ اسلام کے ابھرنے کا یہ موقع بھی جذبات کی رو میں نہ بہ جائے۔ وقت کا تقاضا تو ہر مسلم ملک کے لیے یہ تھا کہ دوسرے عالمِ اسلام پر بوجھ بننے کی بجائے ان کی معاونت کرسکیں۔ یہ حقیقت بینی کی بات تھی کہ آخر ترکی اور پاکستان کو اپنی اپنی جگہ مضبوط کرنا بھی تو عالمِ اسلام کی خدمت تھی۔ عالمِ اسلام کے لیے یہ تڑپ تمام اکابرینِ قوم میں رہی ہے۔ اس سے اتاترک اور قائداعظمؒ خالی کیسے ہوئے۔ پاکستان کا علیحدہ قومیت کے نظریے کے تحت وجود میں لایا جانا بھی تو اسی جذبہ اسلامی کے تحت تھا۔

حاتم علوی صاحب نے مولانا عبید اللہ سندھیؒ صاحب سے بھی اپنی ملاقات کا ذکر کیا۔ اس کا ماحصل بھی یہی تھا کہ عبید اللہ سندھیؒ بھی احیائے اسلام کے جذبے کی چنگاری لیے جگہ جگہ گھومے۔ بڑی بڑی جسمانی تکالیف اور

سختیاں جھیلیں، فاقہ کشی تک کی۔ یکہ و تنہا سوز و گداز کی تصویر بنے گھومتے پھرے کہ مسلمانوں کو بیداری کا پیغام دیں۔ آمادۂ جہاد کریں۔ جب بیس سال بعد وطن واپس پہنچے تو صحت جواب دے چکی تھی۔ زمانہ بدل چکا تھا۔ لوگوں کے طرزِ فکر و تخیل میں انقلاب آ چکا تھا۔ وہ اپنے پرانے تصورت کے تحت سندھ گنگا جمنا کے جغرافیائی رشتہ میں لوگوں کو آزادی کا تصور دلاتے مگر لوگ اپنی ذاتی کشمکشوں، اقتصادی، معاشی، سماجی انفرادیت کے تقاضوں میں ان کی طرف رخ نہ کرتے۔ غرض کہ زمانہ ان کا ساتھ نہ دے سکا۔ حاتم علوی کا کہنا ہے کہ میں نے اسی وقت اندازہ لگا لیا کہ مولانا عبیداللہ سندھیؒ اپنے پرانے تخیلات میں گرفتار ہیں اور اپنے مشن میں کامیاب نہ ہوسکیں گے۔

الغرض حاتم علوی سے گفتگو کا ماحصل یہی تھا کہ اسلام کی خود فطرت میں ہے کہ عالم اس کو اپنائے۔ گو موجودہ مسلمان کسی حالت میں بھی سہی، پیغام تو اپنی جگہ ہے۔ اور دنیا اور زمانہ کے لیے ہے۔ اس کا اب وقت آ گیا ہے۔ احیائے دین کے لیے قوم نے ان بندشوں اور رکاوٹوں سے تو رسّیاں تڑا لی ہیں جنھوں نے صدیوں سے انہیں جکڑ رکھا تھا۔ لیکن قوم کا جسم ابھی مفلوج ہے۔ ان کے آگے راہِ عمل کی نشاندہی کوئی مصلح نہیں کر سکا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عمل پیرائی کے لیے ان کی نظر میں نہ کوئی مثبت اقدام ہے نہ مرکزیت۔ منفی پہلوؤں کا تجزیہ تو برسوں سے اکابرینِ قوم نے کیا۔ اپنی خرابیوں اور کمزوریوں کو بھی برسرِ بام کیا۔ بیرونی خطرات اور شیطنت یہود و نصاریٰ و برہمن کو بھی کھول کھول کر قوم کو بتا دیا۔ اغیار کی تمام ان کوششوں کو بیان کر دیا جو شجرِ اسلام کی بیخ کنی کے لیے صدیوں سے کی گئی ہیں اور ان کے آگے کے منصوبوں سے بھی قوم کو آگاہ کر دیا۔ مگر شیطنت کی اس دسترس سے قوم کو بچانے کے لیے کسی کے پاس

نسخہ نہ تھا۔ ان ظاہری اور باطنی ابتلاؤں سے گلو خلاصی کے لیے نہ کوئی ٹھوس اقدام تھا، نہ منزل کی جانب رہنمائی۔ بات پھر وہی اتاترک اور قائداعظمؒ کے نظریات تک آ جاتی ہے کہ حقیقت بینی سے کام لیتے ہوئے محنت و مشقت کی ایک لانبی منزل پر چل پڑیں۔ پہلے اپنی اپنی جگہ آزادی حاصل کریں۔نظریاتی، اقتصادی، معاشرتی حالت بہتر بناتے ہوئے اپنی دفاعی حالت کو مضبوط بنائیں تاکہ بعد میں دوسرے عالمِ اسلام کے لیے سہارا بن سکیں۔

بے عملی کے اسباب:

حاتم علوی سے گفتگو کے دوران وہ نظریات بھی زیر بحث آئے جن کی بنا پر قوم صدیوں سے بے عملی میں پڑی ہے۔ یہ وہ نظریات ہیں جو جزوِ ایمان کے طور پر قوم کو دے دیئے گئے ہیں۔

ان میں سے ایک مہدی کا انتظار ہے۔مہدی آئیں گے تو احیائے اسلام ہوگا۔ اس وقت تک ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھے رہو۔ اس نظریئے نے سرے سے قوم کو مفلوج اور ناکارہ بنا کر رکھ دیا۔ یہ کسی نے نہ سوچا کہ آخر اپنی زندگی کس لیے تھی اور کیا خطا تھی جو مہدی کے زمانے میں پیدا نہ کیے گئے۔ ٹھنڈے دل سے غور کریں تو یہ نظریہ سوائے یہودی عیاری کے اور کیا تھا۔ دوسرا زہر جو اس قوم کو پلا دیا گیا جو ''اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ'' پر ایمان رکھتی تھی یہ تھا کہ بہتر فرقوں میں تقسیم ہو جائیں گے اور صرف ایک فرقہ جنتی ہوگا۔

اس طرح ہر فرقے نے دوسرے کو دوزخی گردانا اور اسلام کی جمعیت بندی پر ایک ایسی ضرب کاری لگ گئی کہ پھر کبھی ''اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ'' کے پیکر نہ بن سکے۔تیسری چیز ظاہری شریعت کی پابندی پر وہ زور دیا گیا کہ

محبت کی بجائے یہی منافرت اور نفاق کا ذریعہ بن گیا۔ جانِ دین، تسخیر قرآن، حاصلِ شرع سے نظر ہٹ کر ظاہر داری، فروعات اور نفسا نفسی کی طرف لگ گئی۔ یہ کسی نے نہ سوچا کہ جانِ شرع محمدیﷺ جان دین تو جمعیت بندی اور اخوۃ تھی نہ کہ ارکانِ دین کو ادا کر کے اپنی اپنی گلو خلاصی اور فریبِ نظر میں مبتلا ہو جانا۔ مولانا رومؒ نے کیا خوب کہا تھا۔

ما زِ قراں مغز را بردا شتیم
استخواں پیشِ سگاں اندا ختیم

حسنِ معانی سے دینداروں کی یہ خود فریبی کہاں سے کہاں قوم کو لے گئی۔ اسلام کے ارکان نماز، روزہ، حج، زکوۃ تو سب کے سب کسی نہ کسی انداز میں اجتماعیت اور اخوۃ کی طرف قوم کو استحکام بخش رہے تھے۔ چوتھی چیز اسلام کا وہ جذبۂ جہاد، شوقِ شہادت تھا جس کو جہادِ عمل، جہادِ قلم، جہادِ تقریر، جہادِ پندو نصائح، جہادِ ذکر اذکار کے رنگ دے کر اصل جہادِ شمشیر، شوقِ شہادت، حیاتِ جاودانی کے نظریئے سے علیحدہ کر دیا گیا۔ مسلمان کا یہی جذبہ جہاد اور شوقِ شہادت ہی تو تھا جس کے آگے کفار لرزہ براندام تھے کہ ایسی قوم سے کون لڑے جو مرنے سے نہیں ڈرتی بلکہ شوق سے قربان ہونا افضل سمجھتی ہے۔ کیا یہ عین شرع کی بات نہ تھی کہ مجاہد کا ایک قدم میدانِ جنگ میں افضل ہے، اس عبادت سے جو حضرت نوحؑ کی عمر کے برابر کوہِ عرفات پر ادا کی جائے۔ صاحبِ سیف نبیﷺ کی امت کو علم، تبلیغ، ریاضت، زہد، تقویٰ کے چکروں میں ایسا لگایا کہ تلوار ہاتھ میں لینا تو کجا ہر قسم کی جسمانی مشقتوں تک سے اپنے کو بے بہرہ کر بیٹھے۔

سوچنے کی بات تھی کہ آسمانوں میں پرواز کہاں۔ پہلے زمین کے تو اپنے کو وارث بنا لیتے۔ زمین پر تو اپنے قدم جما لیتے۔ مادی چیزوں کو مادی وسیلوں، مادی مشقتوں کے سہارے حاصل کر کے اپنی مادی حالت تو درست کر لیتے۔ جمعیت بندی کے تقاضے اپنا کر اس مادّی اور اقتصادی ابتلاء کو دور کرتے جو صدیوں سے قوم کو گھیرے ہوئے ہے۔ دوسری قومیں، دیکھتے ہی دیکھتے اسلام کے اس جمعیت بندی کے سبق کو اپنا کر کہاں سے کہاں پہنچ گیں۔ مادی دنیا میں انہوں نے کیا کچھ حاصل نہ کر لیا۔ کیا یہ بات اسلام کے عین مطابق نہیں۔ اسلام کسی قوم، کسی ملک کی میراث نہیں۔ اس کا پیام اس کا فیضان تو عالم کے لیے ہے۔ جو جو بھی اسکے فطری اصولوں کو حقیقت بنی سے اپناتا جائے گا وہی اسلام کے قریب ہوتا چلا جائے گا۔ سمجھنے کی بات ہے کہ اسلام جزویات میں نہیں خواہ وہ کتنی ہی مقدس اور متبرک باتیں ہوں۔ اسلام کی دسترس تو زمین سے آسمان تک ہے۔ زمین اپنا مادی وجود، آسمان اس وجود کی لطافتیں، اس کی اخلاقی، قلبی، روحانی صلاحیتیں۔

عشق رسول ﷺ اخوت کی بنیاد:

احیائے اسلام کا پہلا قدم جمعیت بندی ہے۔ محبت ہے، اخوت ہے۔ جذبہ خودعملی ہے۔ جذبۂ جہاد ہے۔ اغیار کی ریشہ دوانیوں اور اپنی تنگ نظری نے کبھی اس اہمیت کو برسرِ عام ہی نہ آنے دیا۔ اخوت اور جہاد، دونوں کی جان مرکزیت تھی۔ وہ عشق رسول ﷺ جو مسلمان کے باطن میں موجود ہے اس کو وہاں پانا ہے۔ ظاہر پر کیا نظر ڈالنی اور کہاں تک اس کی اصلاح کی کوشش کرنی۔ اس جذبے کو اجاگر کرنا ہے۔ جو والہانہ محبتِ رسول ﷺ کی صورت میں

ہر قلب میں موجزن ہے۔

حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد قوم کا ظاہری شیرازہ منتشر ہوگیا۔ خود حضرت عثمانؓ نے فرما دیا تھا کہ اگر تم نے مجھے شہید کر دیا تو پھر قیامت تک یکجا نہ ہوسکو گے۔ نہ اکٹھے ہو کر نماز پڑھ سکو گے۔ احسان ہے حضرت علیؓ کا کہ اپنے باطن میں اس مرکزیت کو قائم رکھا۔ اور شہادتِ حسینؓ نے لا الہ کی بنیاد کو مستحکم کر دیا۔ لہذا یہ مرکزیت اپنے باطن ہی میں پانا ہے۔ یوں بھی مسلمان کے خون میں یہ مرکزیت قائم ہے۔ عشقِ رسولﷺ ہر مسلمان کا نورِ باطن ہے۔ اسی روشنی، اسی عشقِ رسولﷺ کے جذبہ کو اجاگر کر کے اپنی مرکزیت اور اپنی جمعیت کو قوم برقرار رکھ سکتی ہے۔ اپنے اندر دیکھو کہ یہ رشتہ قائم ہے یا جھوٹ ہی کلمہ پڑھ رہے ہو۔ اپنے قلب میں ہی اس روشنی کو پاؤ۔ رحمتِ محمدیﷺ سب کو گھیرے ہوئے ہے۔ آخر رحمتہ للعالمینؐ ہیں۔ اسی حقیقت پر بھروسہ، اعتماد اور یقین مضبوط کر لو تو مرکزیت اب بھی قائم ہے۔ اپنے اندر اپنے محبوبﷺ سے مضبوط رابطہ قائم کرنے سے وہ مرکزیت اور مضبوط ہوتی چلی جائے گی۔ اس کے علاوہ نہ کوئی دوسری راہ ہے نہ حقیقت۔ اسی کا تو یہ کھلا معجزہ ہے کہ باطل کی ہزار کوششوں کے باوجود، اسلام کا شیرازہ بکھر جانے کے باوجود مسلمان کے دل کی یہ روشنی کم نہ ہوسکی۔ مسلمان کا یہ عشقِ رسولﷺ کم نہ ہو سکا۔ آج بھی قلوب میں، اسی کے بل بوتے پر اسلام قائم ہے۔ اسی روشنی میں اسلام کو پھیلنا ہے۔ احیائے دین ہونا ہے۔

بہ مصطفیٰﷺ بہ رساں خویش را کہ دیں ہمہ اُوست
اگر بہ اُو نہ رسیدی تمام بولہبی است

مصطفیٰ ﷺ تک رسائی دین کی بنیاد ہے۔ اس نسبت، اس وسیلے کو اپنے باطن وجود میں پانا ہے۔ مانا کہ حیاتِ طیبہ پڑھ کر اُسوۂ حَسنہ پر عمل کر کے، دربارِ رسول ﷺ میں حاضری دے کر بہت کچھ انفرادی طور پر رشتہ استوار ہو سکتا ہے۔ مگر وہ جمعیت بندی کے تقاضے، وہ اجتماعیت کا مضبوط سلسلہ یوں بھی تو قائم دائم ہونے کی صورت محدود سی ہی رہ جاتی ہے اور اس سے چند خواص کے مقدر روشن ہو جانے تک ہی کی بات بنتی ہے۔ یوں قوم نے اپنی اپنی مقدرت کے مطابق مختلف دوروں میں اپنے انفرادی پہلوؤں کی اصلاح کے لیے کوششیں بھی کیں مگر احیائے اسلام کی وہ صورت کہ ''ادھر سے اُدھر پھر گیا رخ ہوا کا'' کبھی دوبارہ ممکن ہی نہ ہو سکا۔ اب ضرورت ہے کہ ظاہری سطح پر انتشار کے باوجود، قلوب میں اس گرمی کو محسوس کریں جو عزت و غیرتِ اسلام کے نام پر ہر مسلمان میں فطری طور پر موجود ہے۔ کیسی نا امیدی۔ اس رشتۂ اخوت کی بنیاد دلوں میں یقینی طور پر موجود ہے۔ تب ہی تو مسلمانوں کی کامیابی پر ہر ایک کا دل شاداں ہو جاتا ہے اور ناکامی کا اثر ہر قلب پر پڑتا ہے۔ ایک ادنیٰ سی مثال لیں کہ محمد علی کلے کی کامیابیوں اور ناکامیوں کے اثرات کو تمام عالمِ اسلامی کے افراد نے کچھ نہ کچھ اپنے دلوں میں ضرور محسوس کیا ہوگا۔ بس اسی فطری لگاؤ کو اپنی زندگیوں کا چراغ بنا لیں۔ باطن میں یہ مرکزیت، یہ اسلامی اخوت، یہ ناموسِ اسلام، یہ عشقِ رسول ﷺ اس بے بہا میراث کی نشاندہی کر رہے ہیں جو اس قوم کی قسمت میں ودیعت ہے۔ باطن کے ان خزینوں کی طرف ہادیانِ قوم کی توجہ شدت سے مرکوز ہوتی ہے۔ باطن تک رسائی عشق کے ذریعہ ہی ممکن ہے۔ مرکزِ عشق ایک ہی ذاتِ گرامی ہے ﷺ۔ اسی رحمت للعالمینؐ وسیلہ سے، رحمت و محبت و اخوت کا رشتہ قوم کو استوار کرنا ہے۔ اس راہ کا عمل دل کی چاہ

ہے۔ یہاں کا ذکر، یادِ حبیبﷺ ہے۔ یہی بنیادِ دین ہے، یہی ایمان کی پونجی ہے۔ یہ سہارا، یہ بھروسہ نصیب ہو جانے کے بعد ہی زندگی کو فروغ ملتا ہے۔ عمل کی راہ کشادہ ہوتی ہے۔ ارکانِ دین کی پابندی کی حد تک نہیں رہ جاتا بلکہ انسان کی روزمرہ زندگی کو ایک شرفِ انسانیت عطا ہوتا ہے۔ اب مسلمان کی نظر زندگی کے انفرادی پہلوؤں تک محدود نہیں۔ اپنی بلکہ کل کی کل زندگی ایک ہی جذبہ سے سرشار ہو کر اپنی منزل کی طرف گامزن ہوتی ہے۔ اس کا سونا جاگنا، چلنا پھرنا، کھانا پینا، کاروبار، عبادت، ریاضت غرض سب کچھ ایک ہی توحید میں ایک ہی یگانگت میں ہو جاتا ہے۔ گویا دل محبوبؐ کی طرف اور انہماکِ کار اسوۂ زندگی۔ اس طرح خوشنودیٔ خدا اور رسول کی خاطر ہو جاتا ہے۔ ایسا انسان اپنی مَیں سے کبھی کا مر چکا ہوتا ہے۔ اور محبوب کے دامنِ رحمت میں زندگی گزار رہا ہوتا ہے۔ کیسی سختی، کیسی کشادگی، کیسی راحت کیسی تکلیف کیسی تنگ دستی کیسی فراخ دستی، کیسی فتح، کیسی شکست، ہر حال میں ایک چاہنے والے کا دل اپنے محبوب کی طرف رہتا ہے۔ اور اسی تعلق سے اس کی مادی، جسمانی، ذہنی، اخلاقی اور روحانی زندگی کو ایک پائداری اور قیام نصیب ہوتا ہے۔ ہر مسلمان کے لیے محبوبؐ کی یاد بسانے کا انداز کچھ ایسا تو ہو جیسا کہ دُرودِ تاج ظاہر باطن میں بس گیا ہو۔ کلمہ پڑھنے والا اتنی کم از کم گُلِ محمدﷺ کی خوشبو تو دے رہا ہو۔ ایسی کہ جس کو سونگھ کر ہر شخص کہہ سکے کہ کس شاخِ طُوبیٰ کا پھول ہے یہ تو عین فطرت کے مطابق بات ہے کہ جو جس کا تصور کرتا ہے وہ اس کے سامنے ہوتا ہے۔ جو محبوب کی خوشبو کی تلاش میں گلشنِ عالم میں باغِ امت کی طرف قدم رنجہ ہوگا، اس کو یقیناً جگہ جگہ محبوبؐ کی جھلک ملنے لگے گی۔

اجتماعی زندگی:

اس عشق مرکز کی روشنی میں نظر ڈالی جائے تو غیرتِ اسلام اور شانِ دین صرف یہ ہی نہیں کہ اپنی بخشش، نجات، اپنے اپنے مقامات کی فکر میں ہی زندگیاں صرف کر دی جائیں۔ یا صرف ملکوتی صفات کے حصول کو آئینِ بندگی بنا کر اپنے خیال کے مطابق اپنے کو تقویٰ کا نمونہ بنا کر پیش کیا جائے۔ آنِ اسلام تو یہ ہے کہ ان اعلیٰ اقدار کے حصول کے بعد ان کو فلاحِ معاشرہ، فلاحِ انسانی کے کام میں لایا جائے انسانی زندگی کے کلّی پہلو میں ہی اسلام کو اجتماعی طور پر پھلنا پھولنا ہے۔ اس عمل کا دائرہ امکان جسمانی بھی ہے، ذہنی بھی، اخلاقی بھی ہے، روحانی بھی، گویا ساری کی ساری زندگی کا ایک ہی انداز ہونا چاہیے۔ اور یہی حقیقت بینی کا تقاضا ہے۔ زمین کو چھوڑ کر آسمانوں میں تخیلی پروازیں کرتے رہنا کہاں کی دینداری ہے۔ یہ تو بہت کچھ قوم نے اپنے گذشتہ زمانے میں کیا۔ دشمنانِ اسلام کی یہی کوشش رہی ہے۔

مست رکھو ذکر و فکرِ صبح گاہی میں اسے
پختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں اسے

اب احیائے اسلام کے تقاضوں کے تحت، خون پسینہ ایک کر کے میدانِ عمل میں آنا ہے۔ اپنے ہاتھ پاؤں، دل دماغ اور روحانی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر اجتماعی زندگی کے لیے وقف کر دینا ہے۔ اخلاق حسنہ، بے لوث خدمت، اخوت و محبت کے عملی ثبوت اپنی زندگیوں میں پیش کرنا ہیں۔ محض پندو نصائح، عبادت، ریاضت سے قوموں کے کام نہیں بنتے۔ ان دینوی فلاحی

معاشری تقاضوں سے کنارہ کشی تو کجا، اپنی دانست میں صرف ایک پاکیزہ، مطہر اور متقیانہ زندگی گزار لینا معراجِ انسانیت کیونکر شمار ہو سکتا ہے۔ کیونکہ خود معراج والے کو بھی معراج میں اُمتی اُمتی کی لگی تھی۔ کیا یار کی غیرت کا یہ تقاضا نہیں کہ ہمیں جو بھی جسمانی، ذہنی، اخلاقی، روحانی صلاحیتیں ملی ہیں، ان کو ہم کُلی انداز میں اپنی اپنی زندگیوں میں قوم کے لیے بروئے کار لائیں۔ اجتماعی عمل کے لازوال پہلوؤں سے حقیر جانور تک فائدہ اٹھا لیتے ہیں۔ اس لیے انسانی زندگی میں انفرادی تقاضے کیا۔ آخر قوم کا بھی تو ایک پیکر، جان اور روح ہوتی ہے۔

جسم کے سارے حصے ہی مل کر اس کے حسن و جمال کو اجاگر کرتے ہیں تمام عالمِ اسلامی ایک جان، ایک روح، ایک پیکر ہی تو ہے۔ اور یہ بھی صدقہ ہے اس ذاتِ مبارکﷺ سے مسلمان کے قلبی اور باطنی تعلق کا۔ جب ہمارے سب کام ہی خوشنودئ خدا اور رسولﷺ کے لیے ٹھہرے تو ان کی مادی عملی صورت سوائے اُمت کے کاموں کے لیے کوشاں اور سرگرداں رہنے کے اور کیا ہو سکتی ہے۔ کیا ہر شخص اپنے اپنے کام میں لگے رہتے ہوئے اس باطنی تعلق کو اپنی مشعلِ ہدایت و عمل نہیں بنا سکتا؟۔ اس سے زیادہ سعادت اور کیا ہو سکتی ہے کہ اپنا معمولی سا معمولی کام بھی اجتماعیت کے سانچہ میں ڈھل کر ایک جاذبِ قلب و نظر عمل بن جائے۔ قطرہ قطرہ سے ہی دریا بن جاتا ہے اور چھوٹے چھوٹے پتھروں سے پہاڑ۔ یہی تو اجتماعی زندگی کی برکت ہے جس کا سبق اسلام دے رہا ہے۔ زندگی کے اس مثبت پہلو پر نظر رکھی جائے تو خلوص، اخلاص اور وفا سے جو بھی عمل ہم کر رہے ہونگے وہ اپنے لیے نہ ہوگا بلکہ دوسروں کی فلاح کے لیے ہوگا۔ اس میں جمعیت کے کسی علاقے کے افراد ہی

کیا تمام کی تمام عالمِ انسانیت شامل ہوگی۔ ہم ہی میں سے کیا پیشہ ور، کیا مزدور، کیا تجارت پیشہ، کیا ملازم اور حاکم طبقہ، اگر ہم اپنے اپنے کاموں کو فلاحِ انسانیت کے لیے ہی سمجھتے ہوئے کرتے رہیں تو کیا حقِ آدمیت ادا نہ ہو جائے۔ تاریخ شاہد ہے کہ جن اقوام کے لیڈروں اور رہنماؤں میں خلوصِ جمعیت تھا، خلوصِ انسانیت تھا، وہی اس دنیا میں نام چھوڑ گئے۔ یہی غیرتِ اسلام کا تقاضا ہے اور یہی احیائے اسلام کا ذریعہ۔

اسلام کے دامن میں بس دو ہی تو چیزیں ہیں
اِک ضربِ یداللٰہیؑ ، اِک سجدۂ شبّیریؑ

❁❁❁❁